علم کا اک چراغ تھا، نہ رہا

مورخ محقق، مصنف، صحافی اور مشہور عالم

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

نور عالم خلیل امینی مدیر رسالہ "الداعی" عربی واستاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

کئی ماہ سے، مبارک پور اور دیارِ اعظم گڑھ سے آنے جانے والوں کے ذریعے، مسلسل یہ خبر ملتی رہی کہ مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری رہین فراش ہیں۔ انھیں ناک میں کوئی تکلیف تھی جس کا آپریشن کرایا تھا۔ آپریشن کی وجہ سے نقاہت واضمحلال پیدا ہو گیا جو عرصے تک انھیں اپنی گرفت میں لئے رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ صحت یاب ہو گئے ہیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد خبر آئی کہ وہ بخار وغیرہ میں مبتلا ہیں، کمزوری کافی بڑھی ہوئی ہے۔ تا آں کہ یہ خبر صاعقہ اثر سننے کو ملی کہ تحقیق ومطالعہ تصنیف وتالیف، صحافت، تدریس اور تعلقات عرب وہند کے صحرائے ناپیدا کنار کا راہی پر شوق بلکہ مجنون حوصلہ بدوش، شب دوشنبہ، 1417/2/28ھ مطابق 1996/7/15ء کو ٹھیک 9 بج کر 55 منٹ پر دار فانی سے، جو ہم سبھی انسانوں کی سرائے ہے، دار آخرت کو جو ہم سبھوں کا آخری ٹھکانا ہے، سدھار گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے نہ صرف برصغیر بلکہ اسلامی دنیا کے کثیر التالیف اہل تحقیق مورخوں کی صف میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جس کا اس دور قحط الرجال میں، بظاہر حال پر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ خدائے قدیر ہر چیز پر قادر ہے لیکن عرصے سے یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ میدان علم وعمل اور فضل وکمال کا جو یکتا سے روزگار بھی رخصت ہو جاتا ہے، اس کی جگہ خالی ہی پڑی رہ جاتی ہے۔ بالآخر "کام چلاؤ" پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قاضی صاحب نے ،طویل وصبر آزما مطالعے پر مبنی گراں مایہ تصنیفات سے اسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا اور عرب وہند کے تعلقات دیرینہ کے انچھوتے موضوع پر تفصیل ،دقیقہ رسی اور جامعیت کے ساتھ عہد بعہد کام کیا، ہزاروں صفحات پڑھے اور چیونٹی کے منہ سے شکر جمع کرنے کے عمل کے ذریعے کئی عدد ضخیم کتابیں اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تصنیف حقیقت یہ ہے ۔ کہ ان کا یہ کام علمی دنیا پر رہتی دنیا تک کے لیے لائق ہزار شکر احسان ہے ۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی دیوبندی دہلوی متوفی 1404 ، مطابق 1984 ، جنھوں نے اپنے "ندوۃ المصنفین" دہلی سے قاضی صاحب کی اہم ترین تاریخی کتابوں کو خصوصی دلچسپی کے ساتھ شایع کیا تھا، خلافت عباسیہ اور ہندوستان" کے پیش لفظ میں بہت ہی خوب صورت اور معنی ریز جملوں میں قاضی صاحب کی محنت اور انتھک تلاش و تحقیق کی داد دی اور لکھا کہ "اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب لوٹے تو باغ و بہا کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے"۔

ان کا یہ تاریخی سلسلہ ،جس میں "عرب وہند عہد رسالت میں" "خلافت راشدہ اور ہندوستان" "خلافت امویہ اور ہندوستان" "خلافت عباسیہ اور ہندوستان" اور "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" سر فہرست ہیں، بہت مقبول ہوا اور اردو وعربی دونوں زبانوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

تحقیق ومطالعہ طلب اور شب وروز کی محنت کی متقاضی تاریخی وا کیڈمک تصانیف کی تالیف قاضی صاحب کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ سرسری مضامین لکھنے پر قادر نہ تھے کیوں کہ وہ سطحی تالیفات ونگارشات کی آلود گیوں سے پاک دامن ہندوستانی مولفین کے قافلہ قابل رشک کی باقیات میں سے تھے ۔ اسی وجہ سے اپنی بے سروسامانی سادگی ۔شہرت سے دامن کشی اور کاروان نعرہ زن سے بیگانہ رہنے کے باوجود۔ عالم گیر شہرت نے ان کے قدم چومے اور ہمہ گیر نیک نامی نے ان کی بلائیں لیں۔ بالخصوص عرب دنیا میں وہ بڑی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔اس طرح وہ اپنے دین وملت، جس کے وہ ایک قابل افتخار فرزند تھے، کے ساتھ ساتھ اپنے اس ملک کے لیے بھی نیک نامی کا ذریعہ بنے جو اب مسلمانوں کے تئیں ناشکری کی تمام حدیں پھلانگنے پر تلا ہوا ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری اس بات کی تابناک مثال تھے کہ انسان اپنے آپ کو تنگدستی وعسرت کے باوجود اور "چھوٹی جگہ" رہ کر ،اپنی محنت وجاں فشانی اور بلند ہمتی کے ذریعے قابل رشک حد تک بڑا بنا سکتا ہے ۔ انھوں نے حقیقی بڑائی، پائدار نام وری اور قابل قدر مقام ومرتبہ کے عناصر مطلوبہ، اپنے چھوٹے سے گم نام مدرسے بنام احیاء العلوم مبارک پور اور اپنے محدود ماحول والے ایسے قصبے میں حاصل کر لیے جو مروجہ مفہوم میں "تہذیب وتمدن کی روشنی" سے محروم کسی ایسی قابل ذکر علمی وثقافتی سرگرمی سے نا آشنا تھا، جو عالم اسلام کے علمی پایہ تختوں کا امتیاز رہا ہے ۔ جیسے حجاز ۔ دمشق ، قاہرہ، بغداد فارس، رباط ، دہلی اور دیوبند وغیرہ ۔ مکتب کے مرحلے سے اعلیٰ تعلیم تک کے تمام مراحل انھوں نے اسی قصبے میں طے کیے ۔ صرف ایک سال مدرسہ شاہی مراد آباد میں گذارا جہاں دورہ حدیث شریف میں

شرکت کی اور سند فراغ حاصل کیا۔

وہ خود فرماتے ہیں۔

"میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات، قرب وجوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے لیے حق میں بالکل نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے صرف ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا۔ اس کے باوجود حوصلے کی بلندی اور تحصیل علم کی دھن کا حال یہ تھا کہ جامعہ ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا، بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی۔ مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسے کو جامعہ ازہر، جامعہ زیتونہ، جامعہ قرطبہ، مدرسہ مستنصریہ بنالیا اور وطن ہی میں رہ کر خدا کے فضل و کرم اساتذہ کی شفقت و محبت اور اپنی محنت وعزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس دور میں مجھ پر عجیب علمی سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی۔ ہر وقت بغداد و بخارا۔ اندلس وغرناطہ اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہوں اور ان کے اساتذہ و تلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کی حسنات وبرکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا" (قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک" از قاضی اطہر مبارک پوری ص 11 ' 18)

قاضی صاحب کا علم وفضل اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ علم وثقافت اور فکر ودعوت کے میدان میں قابل ذکر کردار ادا کرنے اور جبین تاریخ پر نقش دوام چھوڑ جانے کے لایق بننے کے لیے انسان [illegible] وں اور وسائل، بایقین اتنا ساتھ نہیں دیتے، جتنا کہ خود اس کی ہمت وحوصلہ اور مطلوبہ محنت [illegible] اور برکت ربانی کی آمیزش نے منور کر دیا ہو۔

[illegible] مدارس میں ہمارے ان نوجوانوں کے لیے سامان درس موجود ہے جو اپنے آپ کو بنانے کے حوالے سے تن آسانی، کم کوشی کوتاہ طلبی، عاقبت نااندیشی اور حاصل شدہ موقع، وقت جگہ اور شخصیت کی تمام تر ناقدری کے ساتھ، صرف "خوب سے خوب تر" جگہ اور وسائل فراواں کو پا لینے کی آرزو اور کوشش میں عمر عزیز اور وقت گراں مایہ کا ایک ایسا حصہ ضائع کر دیتے ہیں جس میں یک سوئی، اولو العزمی اور صبر وقناعت کے ساتھ ہنر مندی کے ذریعے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر انسان ذوق طلب اور شوق جستجو سے محروم ہو تو آب حیواں کے چشمہ بے پناہ پر پہنچ کر بھی تشنہ کام ہی واپس آجاتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی ذرا سی عمر کے دورانیے میں بہت سے مذکورہ قسم کے "تشنہ کاموں" کا مشاہدہ کیا ہے اور کر رہا ہے۔

اس حقیقت کا بیان خود قاضی صاحب کی زبان سے سنیے۔

"طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق شوق ہو، تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا بن سکتا ہے اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا۔ مجھے کسی بڑے علمی و تحقیقی اور تربیتی ادارے کی ہوا تک نہیں لگی، نہ کسی بڑی شخصیت کی رہنمائی حاصل ہو سکی، ساتھ ہی میرے ذاتی اور خانگی حالات بھی ساز گار نہیں تھے، اس کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں کہ اپنے

ذوق وشوق، محنت وحوصلہ اور خود سازی کے بل پر وہ سب کچھ حاصل کیا جو بڑے اداروں اور بڑی شخصیتوں کی سرپرستی میں رہ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ہوتا بھی ہے۔ کہ مجھے کسی بڑی شخصیت یا ادارے کے سایے میں جگہ ملتی تو میرا علمی پودا قوت نمو سے محروم ہوجاتا اور کھلی آب وہوا میں اسے آزادانہ پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع میسر نہ آتا"۔

1972ء میں پہلی مرتبہ ان سے لکھنؤ میں شرف ملاقات وتعارف حاصل ہوا۔ وہ مجھ سے یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں بھی مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی 1395ھ /1975ء کا شاگرد ہوں۔ قاضی صاحب چوں کہ بے حد خورد نواز تھے۔ اس لیے یہ سنتے ہی مجھے گلے لگالیا کہ تم میرے استاد بھائی نکلے۔

ان سے دوسری ملاقات دارالعلوم دیوبند کے تاریخی اور بے مثال اجلاس صد سالہ (منعقدہ 1400ھ /1980ء) کے موقع سے اچانک ایک روز صدر گیٹ پر محشر نما بھیڑ میں ہوئی۔ دیکھتے ہی پہچان گئے اور علیک سلیک کے بعد ایک طرف کو کھڑے ہوکر اپنے ہم سفر دو صاحب زادوں کا تعارف کرایا کہ یہ دونوں دارالعلوم سے بھی فارغ ہیں اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بھی۔ میں بے حد متاثر ہوا ان کی اس یاداشت سے کم کہ وہ آٹھ نو سال کے بعد بھی مجھے اپنے خانہ خیال میں محفوظ رکھے ہوئے تھے کہ انھیں مجھ کو پہچان لینے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا، لیکن ان کے اخلاق کریمانہ سے زیادہ کہ وہ اس بھیڑ میں دیکھتے ہی شفقت سے لپٹ گئے، ورنہ ان سے بہت کم درجے کے لوگ اپنی "علمی ساکھ" کا رعب ودبدبہ قائم رکھنے کے لیے عموماً چھوٹوں کو پہچان کر بھی طرح دے جاتے ہیں اور اگر از خود پیش رفت کرکے تعارف کرائے تو تجاہل عارفانہ کے ذریعے اپنی کھوکھلی عظمت کو جلا بخشنے کی کوشش سے نہیں چوکتے۔

پھر دیوبند میں ان سے بار بار ملنے کی سعادت حاصل رہی جہاں وہ رسمی اور غیر رسمی طور پر سال میں ایک سے زاید بار تشریف لاتے رہتے تھے کہ انھیں ہندی ملت اسلامیہ کی مذہبی زندگی کے عنوان دارالعلوم دیوبند سے (وہاں سے رسمی طور پر فارغ نہ ہونے کے باوجود) ایسی محبت وعقیدت تھی جو بعض دفعہ یہاں کے براہ راست فاضل کو بھی نہیں ہوا کرتی، دارالعلوم دیوبند بھی ان کے ساتھ اپنے فاضل باکمال ہی کی طرح عزت واحترام کا معاملہ کرتا تھا۔

ادھر آخری کئی سالوں سے شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی اعزازی سرپرستی قبول کرلنے کے بعد یہاں ان کی آمد ورفت یقینی بن گئی تھی، لیکن علالت پیہم کے باعث قریباً ڈیڑھ سال سے دارالعلوم تشریف نہیں لاسکے تھے۔ ہم اساتذہ کو انتظار ہی رہا کہ وہ اب آئیں گے اور تب لیکن وہ خود یہاں نہ آسکے بلکہ عالم جاوداں کو چلے جانے کی ان کی خبر آئی اور ہم سبھوں کو اداس ودل فگار کر گئی۔

میدان تحقیق وتصنیف وصحافت میں ان کا شہرہ میرے کانوں سے طالب علمی کی صغیر السنی ہی آٹکرایا تھا اور میرے کان، میری آنکھوں سے پہلے ان کا عاشق ہوگئے تھے کہ "الاذن تعشق

قبل العین احیانا "بسا اوقات آنکھوں سے پہلے کان عاشق خوبی کرتے ہیں۔ ملاقات کے بعد آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس کے متعلق خدا کو حاضر وناظر جان کر گواہی دی جاسکتی ہے کہ وہ کانوں کے سنے ہوئے سے فزوں تر تھا اور عربی کے مندرجہ ذیل شہرہ آفاق اشعار کا مصداق۔

لقد کانت محادثة الرکبان تخبرنا عن جعفر بن فلاح اطیب الخبر

فلما التقینا فلا واللہ ماسمعت اذنی باحسن مما قد رای بصری

یعنی آنے جانے والے قافلوں کے ذریعے جعفر بن فلاح کی مسرت بخش خبریں ملا کرتی تھیں۔جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو خدا جانتا ہے کہ کانوں نے (پہلے) اس سے بہتر نہیں سنا جو کہ آنکھوں نے (بعد میں) مشاہدہ کیا۔

لیکن بہت سے "جعفر بن فلاح" ایسے ہیں کہ ان کے متعلق جو کچھ دور سے سنا جاتا ہے، قریب کا مشاہدہ اس کی یکسر تکذیب کر دیتا ہے۔

قاضی صاحب کے متعلق میں نے اپنا یہ تاثر بطور خاص اس لیے ریکارڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ "بزرگوں" کے متعلق دور سے سنے ہوئے آواز سے پیدا شدہ اعتقاد کو قریب کا تجربہ سمار کر دیتا ہے اور زبان حال وقال سے کہنا پڑتا ہے کہ "ان تسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ" یعنی دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کو دیکھ کر ان کے چہرے مہرے سے علم وفکر کی لو باس اور ان کے خدوخال سے طویل تحقیق ومطالعے کا سراغ مل جاتا تھا۔ اللہ نے انہیں طالب علم پیدا کیا تھا۔میں جب بھی یہاں دارالعلوم کے مہمان خانے میں ان کے کمرے میں داخل ہوا، میں نے انہیں کچھ پڑھتے یا کچھ لکھتے ہوئے پایا۔

وہ، تکلف، تصنع اور بناوٹ سے ہر زاویے سے پاک تھے۔لباس وپوشاک، رہن سہن اور زندگی کے تمام شعبوں میں انہیں تصنع سے نفرت تھی۔ وہ تحریر وتصنیف میں بھی تکلف سے بری تھے، اسی لیے ان کی تحریر میں بے ساختگی، سلاست۔اختصار قدرتی باغ کا جمال، خودرو پن سے کی بہار، راست تعبیر کی شیرینی اور آسان پسندی کی نمکینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عصر حاضر کے قلم کاروں کی طرح، ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کی روش پر چل کر، معانی سے زیادہ عبارت کی طوالت، الفاظ کے اسراف بے جا اور ان کے بناؤ سنگار پر توجہ نہیں دیتے تھے، بلکہ وہ جو کچھ لکھتے تھے گواہی کودا ہوتا، ہوتا، چھلکا تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت میں بھی بے تکلف تھے۔ ان سے پہلی ملاقات بھی پرانی اور بار بار کی ملاقات معلوم ہوتی تھی۔ ہر ملنے والے کو ایسا لگتا کہ برسوں سے ان سے جان پہچان ہے۔بلکہ وہ اس کو اس کے بزرگ خان دان یا فرد خان دان محسوس ہوتے۔ اپنی بے ساختہ گفتگو، شیریں کلامی، سادگی، مہر آمیز برتاؤ شفقت شعاری اور انسیت ریز تبسم سے ملنے جلنے والوں میں گھر کر جاتے تھے۔ وہ

علمائے قدیم کی مبارک نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا شعار قناعت پسندی ہوا کرتا تھا، چنانچہ زندگی کے کسی دور میں مادیت کی دل فریبی نے انہیں مسحور نہیں کیا۔

بمبئی ایسے رنگ و نور کے شہر اور دولت و ثروت کی ریل پیل والے ماحول میں بلکہ آسائش حیات کے متلاطم سمندر میں رہ کر بھی اپنے دامن علم کو تر ہونے سے بچائے رکھا اور یک سوئی کے ساتھ داد تحقیق دینے والے بے مثال تصنیفات کی تیاری اور علمی مشاغل میں اپنے کو منہمک کیے رکھا۔ ان کی اکثر اہم تصانیف اسی شہر پر شور میں ان کے قلم سے ڈھلیں۔

قاضی صاحب خود فرماتے ہیں۔

بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا۔ بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ تملق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسے کی فضا میں جو ذہن و مزاج بنا تھا وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہو سکا اور الحمد للہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرے میں بیٹھ کر وہ کام کیا جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی اور تصنیفی و تالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اس سے دولت کمائی جاتی ہے"۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقلاً قیام رہا اور جس شہر میں شبلی مرحوم "کنار آب چوپٹی و گل گشت اپالو" کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے، ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں "مرکز علمی" کا بورڈ لگا کر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کا دور شباب گذارا۔ میں نے بڑے بڑے عقیدت مندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیش کش کرنے والوں کی پیش کش کا شکریہ ادا کر کے شہر کی چمک دمک میں کھو جانے کے مقابلے میں بوریہ نشینی کو ترجیح دی۔ میرے بہی خواہ اور مخلص بزرگ واحباب اس معاملے میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقل مند سمجھتا تھا، بلکہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

"بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ علم کش شہر ہے جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا، اس لیے میں نے دولت و ثروت کے اس اندرون قعر دریا "میں تیس سال سے زائد" تخت بند" ہونے کے باوجود اپنے دامن علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود، عرب و ہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پر کیا"۔

اب نئی نسل کو کس طرح سمجھایا جائے کہ قناعت کتنی بڑی دولت ہے بلکہ عین دولت ہے۔ کہ اس کے ہوتے ہوئے انسان ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں دولت مند ہے اور اس سے عاری ہونے کی صورت میں خزانہ قارون اور دولت فرعون و نمرود کی فراوانی کے باوجود مفلس بے مایہ ہے۔ عربی کے شاعر نے کتنی سچی بات کہہ دی ہے۔

ما کل ما فوق البسیطة کافیا فاذا قنعت فکل شی۔ کافی

یعنی اگر انسان قناعت پسند ہے تو کوئی بھی چیز اس کے لیے کافی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر روے زمین کی تمام چیزیں اس کے لیے نا کافی ہیں۔

قناعت کے ہتھیار کے ذریعے، دنیا کے تمام مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے، بلکہ قناعت پیشہ افراد کے نزدیک دنیا کا کوئی "مسئلہ" مسئلہ نہیں ہوتا، اسی لیے وہ تمام مسائل اور الجھنوں سے یک سو ہو کر صرف اپنے اپنے عظیم اور شریفانہ مقاصد کو بروئے کار لانے میں جٹ جاتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں انسانی برادری کو سعادت و سرخ روئی اور فلاح و بہبود کی دولت نصیب ہوتی ہے ۔ دور آخر میں ہمارے اکابر دیوبند بھی قناعت کی مثال تھے ۔ ان کی قناعت کے قلعے کو منعمان دہر اپنی کسی کوشش کے ذریعے فتح نہ کر سکے اور ان خدامستوں کی زبان حال، سرخ روئی سے یہ شعر پڑھتی رہی۔

اپنی سی چال چل کے رہے منعمان دہر مٹھی نہ کھل سکی مرے دست سوال کی

اسی قناعت پسندی اور فقر غیور کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور اس کی جدوجہد کی شکل میں برصغیر میں اسلامی نشات ثانیہ کی طاقت اور تحریک کی بنا اس طور پر استوار کی کہ اس کا شجرہ طوبی روز اول سے تاہنوز سر سبز وشاداب ہے اور کسی بھی موسم میں برگ وبار لانے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

قاضی صاحب نے قناعت کا درس بچپن ہی سے لینا شروع کر دیا تھا، اپنے گھر میں اور اپنے معاشرے میں جس میں اس وقت لوگ قناعت پسندی و کفایت شعاری اور سادگی کی فطرت پر جنم لیتے تھے اور ان عناصر سے مرکب زندگی جینے میں ایسی راحت وسکون محسوس کرتے تھے، جواب وسائل زندگی سے بھرے پرے اس دور میں کسی انسان کو نصیب نہیں۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"طالب علمی کا پورا دور عسرت اور تنگ دستی میں گذرا۔ کھانے، پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی۔ اس وقت آج کل کی طرح معاش و معیشت میں فراوانی وفراخی نہیں تھی۔ عام طور پر لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے اس لیے تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا۔ بلکہ سب لوگ اسی زندگی پر راضی وخوش رہا کرتے تھے۔ اس میں بڑی خیر وبرکت تھی۔ میں ہر معاملے میں اپنے ذوق وشوق کے مطابق سامان مہیا کرلیا کرتا تھا اور کبھی احساس کم تری کا شکار نہیں ہوا۔

قاضی صاحب "علم کے سچے عاشق تھے۔ انھیں جھوٹی شہرت اور وقتی نام وری سے بے پروا رہ کر علم میں مشقت آمیز وصبر آزما سفر دراز میں بے پناہ لذت ملتی تھی۔ افسوس ہے کہ نسل نو اس لذت سے ناآشنائے محض ہوتی جارہی ہے، اسی لیے اس کی تخلیقات اور نتائج مطالعہ و تصنیفات میں گہرائی اور دقت نظر کا دور دور تک پتہ نہیں، بلکہ سطحیت ہی اس کی شناخت بن گئی ہے۔ اس لیے کہ علم وتحقیق کی راہ میں قاضی صاحب ان کے بعض ہم عصر اور ان کے اکثر پیش رو جس طرح "مکارہ" (ناپسندیدہ چیزیں

یعنی مصائب و تکالیف) کو برداشت کرنے بلکہ انہیں شیریں سمجھنے کے عادی تھے، یہ سخت نسل نوہیں معدوم ہو گئی ہے اور لگتا ہے کہ ماؤں نے اب سابقہ نسل کے لوگوں کو جنناچھوڑ دیا ہے۔

فروغ شمع جواب ہے، رہے گی رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

شمع علم تو جلتی رہے گی، لیکن تشویش کا بات یہ ہے کہ اس پر نثار ہونے والے پروانے اب ناپید ہوتے جارہے ہیں۔

علم کے ساتھ ان کے عشق و خلوص کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی کسی کتاب کا ذاتی طور پر نہ تو حقوق طبع محفوظ کرایا، نہ ہی معاوضے کی بات کی، نہ رائلٹی لی، بلکہ خدمت علم کے جذبے سے کتابیں لکھیں اور اسی جذبے سے مختلف ناشرین کو ان کی طباعت واشاعت کی اجازت دے دی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ناشرین نے (جو کہ عموماً نامعقول اور ناخدا ترس ہوتے ہیں) اپنے لیے "جملہ حقوق طبع بحق ناشر محفوظ ہیں" کے ساتھ ان کی کتابیں چھاپیں۔ اس عمومی اجازت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ "حقوق طبع بحق مولف محفوظ" والی کتابیں عموماً مولف کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد نایاب ہوجاتی ہیں۔ نیز ان کے ورثہ کے آپسی اختلاف کی آماج گاہ بن کر اہل علم کے لیے باعث اذیت وافسوس بن جاتی ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانوی کی کوئی کتاب اسی لیے نایاب نہیں ہوتی کہ انہوں نے محض خدمت دین وعلم وعقیدہ وملت کی خاطر کتابیں لکھیں اور ہر ایک کو چھاپنے کی عام اجازت دے دی۔

سادگی، تواضع، بے تکلفی، قناعت شعاری، ملنساری، شفقت آمیز برتاؤ، نرم خوئی، علمی انہماک، مطالعہ و تصنیف میں محویت، دنیا کی لذتوں اور مادیت کے سحر سے مکمل آزادی اور شہرت سے نفرت وغیرہ قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے۔

قاضی صاحب، میانہ قد، قدرے کشادہ جبیں، متوازن الجسم، گندم گوں رنگ، گھنی داڑھی والے قوی الحافظہ ذہین اور اپنے ملنے جلنے والوں کو بہت دنوں تک یاد رکھنے والے آدمی تھے۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے شروع ہی میں بینائی کمزور ہو گئی تھی اس لئے بہت پاور کا موٹے شیشے والا چشمہ استعمال کرتے تھے نہایت خود دار آدمی تھے۔ زندگی اور انسانوں سے بہت پر امید رہا کرتے تھے۔ وقت کے قدرداں تھے، جو ایک سچے خادم علم کا ممتاز خاصہ ہوا کرتا ہے۔ دنیوی غموں سے آزاد اور علمی مشاغل کے غلام تھے۔ ترفع اور خود پسندی سے کوئی مناسبت نہ تھی البتہ خود سازی پر ان کی توجہ ہمیشہ مرکوز رہی۔ بہت سے اہل علم وقلم کی طرح اپنی تعریف آپ کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی دوسروں کو حقیر یا کم رتبہ سمجھتے تھے۔ دوسروں سے بات چیت کرتے وقت پرسکون رہتے۔ طلبہ اور اہل علم سے بے حد محبت کرتے اور متکبروں اور انانیت شعار لوگوں سے زیادہ نفرت کرتے تھے خواہ وہ کسی قدوقامت کے ہوں۔

مختصر سوانحی خاکہ

ولادت اور نام ونسب۔

قاضی صاحب کی ولادت 4رجب 1334ھ مطابق 7مئی 1916 کو صبح پانچ بجے مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ان کے جد اعلیٰ سلطان نصیر الدین ہمایوں (914ھ- 964- 1508ء- 556ء-) کے عہد سلطنت میں، کڑامانک پور سے، راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد چشتی مانک پوری متوفی 2 شوال 965 ھ بانی مبارک پور کے ہم راہ، مبارک پور آبسے تھے۔ قاضی صاحب کے خاندان میں اسی زمانے سے نیابت قضا کا عہدہ چلا آرہا تھا۔ اسی مناسبت سے انہیں اور ان کے تمام اہل خاندان کو قاضی کے سابقے کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کے نانا مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی 26 رجب 1359 ھ نے ان کا نام "عبدالحفیظ" رکھا تھا لیکن وہ قلمی علمی دنیا میں قاضی اطہر مبارک پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

مولانا عبدالحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری بن شیخ حاجی محمد حسن بن شیخ حاجی لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی۔

ان کے والد شیخ حاجی محمد حسن نے 11 ربیع الاول 1398 ھ میں وفات پائی۔

پس ماندگان

قاضی صاحب نے اپنے پیچھے اہلیہ محترمہ (خدا صحت کے ساتھ انہیں عمر دراز بخشے) کے علاوہ چار صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں چھوڑی ہیں۔ ماشاء اللہ سبھی صاحب اولاد ہیں۔

سب سے بڑے لڑکے مولانا خالد کمال صاحب دارالعلوم دیوبند اور مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ہیں۔ اس وقت سعودی عرب کی وزارت امور مذہبی کی طرف سے گھانا میں بر سر تدریس و دعوت ہیں۔ دوسرے لڑکے مولانا حاجی ظفر مسعود صاحب جامعہ مفتاح العلوم مئو کے سند یافتہ ہیں۔ اپنے وطن مبارک پور میں کاروبار میں مشغول ہیں تیسرے لڑکے مولانا سلمان مبشر صاحب دارالعلوم دیو بند اور مدینہ یونیورسٹی کے فارغ ہیں۔ پہلے گھانا میں تدریس و دعوت میں سر گرم عمل رہے۔ اب مدرسۃ المساکین، بہادر گنج، ضلع غازی پور میں مدرس ہیں۔ چوتھے لڑکے قاضی احسان احمد صاحب، شبلی کالج اعظم گڑھ کے ڈگری ہولڈر ہیں اور مبارک پور ہی میں اپنا میڈیکل اسٹور چلا رہے ہیں۔

صاحب زادیوں میں بڑی صاحب زادی "ام سلمہ" اپنے شریک حیات جناب ماسٹر مصباح الدین

کے ساتھ فیروز آباد میں رہائش پذیر ہیں جہاں ماسٹر صاحب انٹر کالج میں استاد ہیں۔ جب کہ دوسری صاحب زادی "شمیمہ" جناب رضوان احمد ساکن "نوادہ" ضلع اعظم گڑھ کو منسوب ہیں۔ رضوان صاحب بھی مدینہ یونیورسٹی کے فیض یافتہ ہیں۔ اس وقت اپنے وطن ہی میں برسر تجارت ہیں۔

حصول تعلیم۔

قاضی صاحب نے قاعدہ بغدادی، ناظرہ قرآن شریف اور اردو وغیرہ کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے بابرکت رواج کے مطابق محلے کے خانگی مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد جب کہ وہ قرآن پاک کا تیسرا پارہ ناظرہ پڑھ رہے تھے۔ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل ہوئے۔ اسی مدرسہ میں قرآن پاک ختم کیا پھر اردو فارسی کی تعلیم پندرہ سال کی عمر تک بقول ان کے کھیل کود کر حاصل کی۔

صفر 1350ھ سے شعبان 1359ھ کے دوران درس نظامی میں پڑھائے جانے والے تمام وعلوم وفنون کی تحصیل، مدرسہ احیاء العلوم ہی میں کی۔ البتہ شوال 1358ھ تا شعبان 1359ھ کا ایک سالہ تعلیمی زمانہ، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں گذارا جہاں انہوں نے دورہ حدیث شریف میں مولانا سید فخر الدین احمد متوفی 1392ھ مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی متوفی 1395ھ اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی متوفی 1395ھ ایسے اساتذہ یگانہ سے فیض پایا۔ درمیان میں 1354ھ میں بھی انہوں نے جامعہ قاسمیہ میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن ناگزیر اسباب کی بنا پر صرف 2 ماہ بعد مبارک پور واپس آگئے تھے۔

مدرسہ احیاء العلوم میں جن اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذتہ کیا ان میں قابل ذکر یہ ہیں۔ مولانا مفتی محمد یسین مبارک پوری متوفی 1404ھ مولانا محمد شکراللہ مبارک پوری متوفی 1361ھ مولانا بشیر احمد مبارک پوری متوفی 1404ھ، مولانا محمد عمر مظاہری مبارک پوری، اور ان کے اپنے ماموں، مولانا محمد یحییٰ رسول پوری متفی 1387ھ۔

اپنی مختصر خود نوشت سوانح حیات میں انہوں نے مبارک پور اور قرب وجوار میں ان کے زمانے میں موجود، ان علماء اور اہل کمال کے نام گنائے ہیں، جن کے کاموں اور کارناموں کو دیکھ سن کر ان کے اندر علمی حوصلہ بیدار ہوا اور ان سے کسی نہ کسی طرح راہنمائی ملی۔ ان میں سر فہرست ان کے جد محترم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی 1359ھ ہیں، جو متبحر عالم، مدرس، مصنف، ادیب، طبیب حاذق اور عربی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ دوسرے مولانا عبدالرحمن مبارک پوری صاحب "تحفۃ الاحوذی" متوفی 1353ھ تیسرے مولانا عبدالسلام مبارک پوری مصنف "سیرۃ البخاری" متوفی 1343ھ۔

نیز علوم وفنون کی پچاسوں ان امہات الکتب کے نام بھی لیے ہیں جنھیں انھوں نے عار یتاً یا خرید کر پڑھیں اور ان کے ذریعے اپنی علمی صلاحیت کو پختہ کیا اور ثقافتی اثاثے کو وسعت دی، جس کے طفیل علمی دنیا میں دھوم مچادینے والی تصنیفات ان کے قلم سے نکلیں۔

ان کی علمی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ طالب علمی کے اولیں دور سے ہی جب کہ وہ عسرت کی زندگی گذار رہے تھے۔ درسی کتابوں کے علاوہ بہت سی غیر درسی مطبوعات و مخطوطات خریدیں اور جو نایاب تھیں انہیں اپنے قلم سے نقل کرلیں کہ اس زمانے میں آج کی طرح فوٹو اسٹیٹ کی کوئی سہولت نہ تھی۔ انھوں نے اپنی مختصر آپ بیتی میں خریدی ہوئی کتابوں کی فہرست، اس زمانے میں ان کی قیمتیں اور اکثر کتابوں کی تاریخ خرید نیز نقل کی ہوئی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔

انشااور مضمون نگاری کا ذوق۔

مضمون نگاری کا شوق ان کے اندر اپنے نانا مولانا احمد حسین متوفی 1359 ھ کی صحبت سے پیدا ہوا۔ جن کے ذاتی کتب خانے میں علم وفن کی بے بہا کتابیں کثرت سے موجود تھیں اور انھیں تصنیف و تالیف کا صاف ستھرا مذاق تھا۔ مطالعہ و کتب بینی کے رسیا تھے۔ ان کی نشست کے کمرے میں ہر چہار جانب کتابیں مطالعہ کے لیے چٹائی پر بکھری رہتی تھیں۔ قاضی صاحب کو چوں کہ لکھنے پڑھنے کا خداداد شوق تھا۔ اس لیے ان کی تربیت اور طریق مطالعہ و تصنیف سے اپنے شوق کو مہمیز کیا۔ لیکن باقاعدہ راہنمائی انھوں نے کسی سے حاصل نہیں کی بلکہ اس سلسلے میں صرف ان کے ذوق اور خود اعتمادی نے ان کا حوصلہ بڑھایا وہ فرماتے ہیں کہ۔

"معلومات کی فراہمی، ان کی ترتیب اور اسلوب نگارش وغیرہ میں چوں کہ کسی کی راہنمائی حاصل نہ ہو سکی، اس لیے ایک مضمون کئی کئی بار لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیا اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا ساتھ ہی خیال ہوتا کہ یہ مضمون قابل اشاعت ہوا کہ نہیں؟ مگر جب بغیر کسی حک واضافے کے چھپ جاتا تو حوصلے میں نئی جان آجاتی اور فوراً دوسرا مضمون تیار کرنے میں لگ جاتا"

انھوں نے اشارہ کیا ہے کہ انہیں مضمون نگار بنانے اور تصنیف و تالیف کے لیے حوصلہ دینے میں؛ مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی 1395ھ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ مراد آباد سے رسالہ "قائد" نکالتے تھے۔ اتفاق سے 1357ھ میں احیاء العلوم مبارک پور کی جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے بلائے گئے۔ اس موقع سے مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کو عبدالحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری شاعر اور مضمون نگار کا تعارف ہوا اور انھوں نے قاضی صاحب کو رسالہ "قائد" میں مضمون لکھنے کی دعوت دی چنانچہ مستقل طور پر رسالہ "قائد" میں ان کے مضامین اور اشعار چھپنے لگے۔ شاعری اور مضمون نگاری کا تسلسل تالیف پر منتج ہوا اور انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں پانچ کتابیں لکھ ڈالیں۔ دو عربی میں اور تین اردو میں۔

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد کے مشاغل۔

ازشوال 1359 ھ تا 1364 ھ 1940 ء تا 1944 ء مدرسہ احیاءالعلوم مبارک پور میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ اس دوران شباب کمپنی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی) کے لیے سید جمال الدین افغانی (1254 ھ 1314 ھ 1839 ء 1897 ء) کے دو عربی رسالوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

27 نومبر 1944ء تا 12 جنوری 1945ء مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر سے منسلک رہے۔ اس دوران رد شیعیت و قادیانیت میں مضامین لکھے، لکھوائے اور چھپوائے۔

13 جنوری 1945ء تا یکم جون 1946ء زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور سے منسلک رہے۔ اس عرصے میں ساڑھے نو سو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتب کی۔

قیام لاہور کے دوران قاضی صاحب کے والد صاحب حج کو گئے؛ تو شوال 1366 ھ تا صفر 1367 ھ (یکم اکتوبر 1946 ء تا جنوری 1947 ء) مدرسہ احیاءالعلوم مبارک پور میں عارضی مدرسی کی۔

17 جنوری 1947 سے سہ روزہ زمزم روزنامہ ہو گیا تو اس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط 1396 ھ /1976 ء کے زیر تربیت اس سے وابستہ ہو کر صحافت سیکھی۔ تقسیم ملک سے کچھ دن پہلے دونوں اس ارادے سے اپنے وطن آگئے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد لاہور واپس آجائیں گے۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی کے دراز تر ہو جانے کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

1948ء کے آغاز میں بہرائچ سے ہفت روزہ "انصار" نکالا "حکومت کے عتاب کی وجہ سے آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔

شوال 1367 ھ تا شعبان 1368 ھ، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تعلیمی خدمت انجام دی۔

جمعہ 28 ذی الحجہ 1368 ھ نومبر 1949 ء کو وہ بمبئی وارد ہوئے جو ان کے علمی سفر کی آخری منزل تھی اور جہاں انھوں نے تیس سال سے زائد مدت تک قیام کر کے اہم علمی، ثقافتی اور صحافتی کارنامے انجام دیے۔

بمبئی میں انہوں نے شروع میں دفتر جمیعتہ علماء صوبہ بمبئی میں افتا اور دیگر تحریری کام کیے۔ پھر روزنامہ جمہوریت میں نائب مدیر رہے۔

13 فروری 1951 ء سے مارچ 1991 ء تک یعنی چالیس سال سے زائد مدت تک روزنامہ "انقلاب" میں "جواہر القرآن" اور "احوال و معارف" کے عنوان سے علمی، دینی، سیاسی اور تاریخی مضامین لکھتے رہے۔

1952ء جب انجمن خدام النبی کی طرف سے ماہنامہ اور ہفت روزہ "البلاغ" نکلنا شروع ہوا تو دونوں کی ادارت میں کام کرنے لگے۔ ہفت روزہ "البلاغ" تو کچھ ماہ بعد بند ہو گیا، لیکن ماہنامہ "البلاغ" پچیس سال تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔

12 نومبر 1960 سے دس سال تک انجمن اسلام ہائی اسکول میں دینیات و اخلاق کی تعلیم دی۔ نیز اسی دوران دارالعلوم امدادیہ بمبئی میں جزوقتی مدرسی کی۔

1951ء میں بھیونڈی میں "مفتاح العلوم" کی بناڈالی جو تاہنوز سر گرم عمل ہے۔

اردو تصانیف۔

(1)عرب وہند عہد رسالت میں (2) خلافت راشدہ اور ہندوستان (3) خلافت امویہ اور ہندوستان (4) خلافت عباسیہ اور ہندوستان (5)ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (6)اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (7) مآثر ومعارف (8) دیار یورپ میں علم وعلماء (9) آثار واخبار (10) مختصر سوانح ائمہ اربعہ (11.) تدوین سیر ومغازی (12) خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت (13) خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات (14) معارف القرآن (15) علی وحسین (16) طبقات الحجاج (17) تذکرہ علمائے مبارک پور (18) تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں (19) افادات حسن بصری (20) اسلامی نظام زندگی (21) حج کے بعد (22) مسلمان (23) اسلامی شادی (24) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔

عربی تصنیفات۔

(25) رجال السند والھند (26) العقد الثمین فی فتوح الھند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین (27) الھند فی عہد العباسیین۔

قابل ذکر ہے کہ کتاب نمبر (1) اور نمبر (5) کے ترجمے بھی عربی زبان میں قاہرہ سے چھپ چکے ہیں۔ دونوں ترجمے ایک مصری عالم کے قلم سے ہیں۔

عربی میں تحقیق وتحشیہ۔

(28) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول لابی الفیض محمد بن محمد بن علی حنفی فارسی (29) تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین البغدادی (30) دیوان احمد، جو ان کے نانا مولانا احمد حسین کے عربی اشعار کا مجموعہ ہے۔ قاضی صاحب نے اسے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔

علمی ودینی اسفار۔

قاضی صاحب نے پانچ حج کیے۔ پہلا حج 1375ھ میں، دوسرا 1385ھ میں، تیسرا 1393ھ میں، چوتھا 1397ھ میں، پانچواں 1402ھ میں۔

چوتھے حج 1397ھ 1976ء کے بعد انہوں نے بلادعرب وافریقہ کا علمی وثقافتی دورہ کیا۔ وہاں کے ممتاز علماء سے ملے، کتب خانوں سے استفادہ کیا، نادر کتابوں کی معلومات حاصل کی اور عالم اسلا کے ایک معتد بہ حصے کے مسلمانوں کے حالات ومسائل سے قریب سے واقف ہوئے۔ جن ملکوں اور شہروں میں گئے، ان کے نام اور اسفار کی تفصیل انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دی ہے۔

اعزازی نشانات وانعامات۔

مارچ 1984ء میں تنظیم فکر ونظر سکھر کو دعوت پر سندھی ادبی میلے میں شرکت کی۔ اس موقع سے انہیں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق (ش 3 محرم 1409ھ مطابق 17 اگست 1988ء بروز ۱۹۸۵ء)

چہارشنبہ) کے ہاتھوں تنظیم کا اعزازی نشان، سندھ کی روایتی چادر اور ٹوپی دی گئی۔

1400ھ میں اسلام آباد پاکستان میں منعقدہ تیسری عالمی کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں مدعو ہوئے اور شرکت کی۔ اس موقع سے جنرل ضیاء الحق مرحوم نے انہیں ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلی اور ایک حمائل شریف تحفے میں دیا۔

اگست 1986ء میں تنظیم فکر و نظر سندھ نے قاضی صاحب کی اپنے ہاں کی چھپی ہوئی کتابوں کی رسم اجراء میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے، قاضی صاحب کو دعوت دی۔ وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ کی صدارت میں، تاج محل ہوٹل کراچی میں ایک شان دار و پر وقار جلسہ ہوا، جس میں چوٹی کے پاکستانی اہل علم و قلم و ادب و ماہرین قانون و ماہرین تعلیم و تربیت نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔

15 اگست 1984ء کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے، عربی زبان اور علمی و تحقیقی کارناموں کے پیش نظر، توصیفی سند، کشمیری چادر اور پانچ ہزار روپے نقد سالانہ تاحیات کی پیش کش کی گئی۔ 1998 میں یہ رقم دس ہزار کر دی گئی تھی۔

وہ ادارے جن کے ممبر یا سرپرست ہے۔

(1) معتمد انجمن تعمیرات ادب مزنگ لاہور، (2) مشیر علمی ادارہ التراث العربی کویت (3) (7) رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (8) سرپرست شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند (9) اعزازی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ (10) اعزازی مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی (11) رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم ندوۃ العماء لکھنؤ (12) رکن مجلس شوریٰ تاج المساجد بھوپال (13) رکن مجلس شوریٰ جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور (بہار)۔

خدائے پاک انہیں دین و علم کی بے بہا خدمت کے طفیل، جنت الفردوس میں جگہ دے اور جوار انبیاء صدیقین و شہداء و صالحین سے نوازے۔ پس ماندگان اور متعارفین اور اہل قرابت کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا کرے اور ہم سبھوں کو ان کے علم و فضل سے مستفیض کرے اور ان کے بعد کے خلاء کو بہتر طریقے سے پر کرے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بقیہ ص ۱۷

آزاد اسلامی ریاست کی مقدس فضاؤں میں چار دن گذارنے کے بعد ہم نے واپسی کیلئے رخت سفر باندھا۔ اور یہ سوچتے ہوئے واپس ہوئے کہ ایک بار پھر نسوانی حکومت والی سرزمین میں داخل ہو رہے ہیں۔

------یارب ایں خاک پریشاں از کجا بر داشتم

اس امید کے ساتھ کہ ایک دن اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پر بھی رحم فرماتے ہوئے اس کو اسلامی خلافت کا گہوارہ بنائے گا۔

ع------ کب نظر آجائے گی بیداغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد